# رسائل و مسائل

## اسلامی نظام میں کفالتِ عامہ

سوال :۔ "ترجمان القرآن" بابت شوال ۱۳۶۸ھ کے مندرجات سے چند سوالات پیدا ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں، تصریحات فرما کر ممنون فرمائیں :۔

(۱) اپنی کمائی اور وراثت میں تقسیم دولت کی مساوات خلافِ اسلام ہے۔ یہ تسلیم۔ لیکن کیا کفالتِ عامہ کے سرکاری وظائف میں مساوات ضروری نہیں ؟

"زیادہ سے زیادہ مدت جو مساواتِ عامہ پیدا کرنے کے لئے درکار ہے وہ دس سال سے زائد ہوگی "۔۔۔۔ یہاں "مساواتِ عامہ" سے کیا مراد ہے ؟ کیا مساواتِ عامہ اسلام کا منتہائے نظر ہے ؟ حکم قرآنی یا ارشادِ نبوی یا ارشادِ صحابہ سے استنباط فرمایا جائے :۔

جواب :۔ (۱) کفالتِ عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ریاست کو جو شخصی امدادیں نقدی یا سامانِ ضروریہ کی شکل میں دینی پڑیں گی وہ برابر نہیں ہوسکتیں۔ اسکی وجہ ظاہر ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک خاندان کا کوئی ذریعۂ آمدنی سرے سے نہیں ہے، لیکن دوسرے خاندان کو ضروریات سے کم آمدنی ہو رہی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اوّل الذکر کو ریاست کا بیت المال زیادہ وظیفہ دے گا اور مؤخر الذکر کو صرف اتنی رقم دی جائے گی جس سے اسکی کمی پوری ہوجائے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ ایسا بھی ہوگا کہ ایک شخص محتاجِ اعانت ہے اور اس کے سر پر چھ افراد کی کفالت کا بار ہے، دوسرا درخواست دیتا ہے اور اس پر پندرہ آدمیوں کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہے، ان دونوں کو بیت المال برابر برابر کے وظائف نہیں دے گا۔ پھر یوں بھی ہوگا کہ ایک خاندان کو ریاست سال بھر تک ایک خاص ماہانہ وظیفہ دیتی ہے لیکن کسی دوسرے خاندان کو صرف دو ماہ تک ہی ایسی اعانت کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے بعد اس کے لئے ذریعۂ معاش نکل آتا ہے۔ انہی وجوہ کے پیشِ نظر میں نے اپنے مضمون میں جو بجٹ دیا ہے وہ مختلف قسم کے کنبوں کے لئے مختلف مقدار کی رقومِ وظائف کو شامل ہے۔

"مساواتِ عامہ" کی نو ایجاد اصطلاح سے مراد جو اجتماعی حالت ہے وہ یہ ہے کہ :-

ا- لوگوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے لوازمات بہر حال عام ہو جائیں اور ان میں محرومی باقی نہ رہے،

ب- معاشی جدوجہد کے مواقع میں برابری پیدا ہو جائے اور ایک طبقے کے لوگ ایسے بے بس نہ ہوں کہ دوسروں کی غلامی میں معاشی زندگی بسر کریں،

ج:- معاشی عدمِ مساوات جس حد تک تقاضائے فطرت ہے، اس سے بڑھنے نہ پائے تاکہ اخلاقی مساوات بحال رہ سکے۔

یہاں مدعا یہ نہیں کہ فرد فرد ہر لحاظ سے برابر سرابر ہو کہ نقدی، وسائل، مکان، زمین، سامان کی جتنی مقدار ایک کے پاس ہو اتنی ہی دوسرے کے پاس بھی ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ سوسائٹی کی عام فضا اتنی اصلاح پذیر ہو جائے کہ جائز فطری حدود سے بڑھی ہوئی ناہمواریاں نہ ہوں اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں پوری پبلک برابر کے حقوق پائے۔ "مساواتِ عامہ" کی یہ اصطلاح مفرد تصور پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ یہ اس حالت کا نام ہے جس کے پیدا کرنے کے لئے ایک طرف یہ حکم ہے کہ ریاست کی آمدنیاں کہیں طبقۂ امراء ہی میں گردش نہ کرتی رہیں اور کہیں یہ حکم ہے کہ اسلامی ریاست فقراء، مساکین، اور دوسرے ضرورت مندوں پر صرف کرے وغیرہ۔

---

## قراردادِ مقاصد اور ہمارے حکمران

سوال:- (۱) قرارداد مقاصد کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے اور نہایت شرافت سے پاس کیا" یہ نہایت شرافت کی شرط جو لگائی گئی ہے کیا یہ طنز ہے یا حکومت کی نیک نیتی پر دال ہے؟ - اگر حکومت نیک نیت نہیں تو پھر شرافت کا کیا تعلق ہے۔

قرارداد مقاصد اگر محض "بورڈ" ہے، لیبل ہے، اشتہار ہے، تو کیا اس خالی تختے کے لگنے سے اتنا انقلاب آگیا ہے کہ ہم ان انتخابات، اسمبلیوں اور اداروں میں حصہ لیں جو اس سے پہلے ممنوع و مردود تھے؟ یہ بورڈ نہ ہوتا تو اندر جاکر حالات بدلنے کی کوشش سے گریز کرنا ضروری ہوتا۔

(۲) قراردادِ مقاصد کی ماہیت کے متعلق جماعت اسلامی کی طرف سے جو بیانات اور تصریحات شائع

پذیر ہوئے ہیں، غالباً آپ نے ان کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ اگر یہ شبہ درست ہو تو اس سلسلے کی ضروری چیزوں کو بغور پڑھ لیجئے۔ یہاں مختصراً چند اشارات عرض کئے جاتے ہیں، شاید ان سے آپ کو صورتِ واقعہ کے سمجھنے میں مدد مل سکے:۔

ا۔ قرارداد مقاصد درحقیقت ملتِ پاکستان کا اعلان ہے جسے اس نے اپنے مقرر کئے ہوئے چند نمائندوں کے ذریعے دستوری حیثیت سے نشر کرایا ہے، تاکہ یہ آئندہ بننے والے دستور و نظام کی اساس قرار پائے۔ اس میں دیکھنا یہ نہیں کہ اعلان کرنے والے اشخاص کون تھے، اور ان کی نیتیں کیا تھیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ ملت کیا چاہتی تھی اور اسکی نیت کیا ہے۔ اس قرارداد کے پاس ہو جانے کے بعد اب چاہے اس کے پاس کرنے والے اپنی تقریروں میں اور اپنے عمل سے اس کے ایک ایک لفظ کی تردید کرنے کی کوشش کریں، جب بھی اس کا ہر لفظ اٹل ہے، تاوقتیکہ (خدانخواستہ) ملت خود اس سے انحراف کا فیصلہ نہ کرے۔

ب۔ جہاں تک ریاستِ پاکستان کے وجود کو پیشِ نظر رکھکر قراردادِ مقاصد کی حیثیت متعین کرنے کا سوال ہے، اس قرارداد کی نوعیت بالکل وہی ہے جو کسی فرد کے کلمۂ طیبہ ادا کرنے کی ہوتی ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے نبی کی شریعت کی پابندی میں زندگی بسر کرنے کا وعدہ و اقرار کرتا ہے اور اس اقرار کی بنیاد پر اسے مسلمان ہونے کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ ریاست کی زبان دستور ساز اسمبلی ہوتی ہے اور اس نے بھی خدا کی حاکمیت اور اس کے نبی کی بتائی ہوئی "حدود اللہ" کی پابندی کا اقرار کرکے گویا پوری ملت اور ریاست کی اجتماعی ہستی کی طرف سے کلمۂ طیبہ ادا کیا ہے اور اس بنیاد پر اسکو اسلامی ریاست کے سارے حقوق حاصل ہو چکے ہیں۔

ج۔ لوگوں کو کھٹک جو ہوتی ہے وہ ساری کی ساری اس وجہ سے ہے کہ ہمارے ملک کے لیڈر اور حکمراں جنہوں نے ملت و ریاست کے مقرر کردہ وکیلوں کی حیثیت سے ملت و ریاست کی طرف سے کلمہ ادا کیا ہے، وہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ لوگ نہیں ہیں اور نہ اس کلمہ کی ادائی کے بعد ان میں کوئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ حالانکہ ریاست ایک الگ چیز ہے اور اربابِ قیادت یا حکمراں الگ چیز ہیں۔ حکمراں جو قصور کریں وہ ان کے اپنے قصور ہیں اور ریاست میں اگر کوئی صفت پائی جائے تو وہ اسکی اپنی صفت ہے۔ ریاست غلط ہو جائے تو اسے درست کرنے کے لئے پورے دستوری نظام کی اصلاح کرنی پڑتی ہے اور حکمراں بگڑ جائیں تو یا تو ان کو راہِ راست پر لایا جاتا ہے یا ان کو الگ

کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جب جماعت اسلامی حکمرانوں کی اصلاح سے مایوس ہو گئی تو اس نے انقلابِ قیادت کی دعوت عام کا آغاز کر دیا اور اب وہ نئے حکمرانوں کو اوپر لانے کی جدوجہد میں مصروف ہے درحقیقت حکمرانوں اور لیڈروں کا مقام ایک ریاست کے تعلق سے بالکل وہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک عبادت گاہ کے خدام کا ہوتا ہے جنہیں اس عبادت گاہ سے تعلق رکھنے والے عوام مقرر کرتے ہیں۔ اب اگر کسی عبادت گاہ کے خدام اُس عبادت گاہ میں فسق و فجور کے ہنگامے گرم کریں، درآنحالیکہ خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس عبادت گاہ کے صدر دروازے پر "مسجد" کا بورڈ لگایا ہو تو اوّل تو اُن سے باز پرس کی جائیگی کہ اس بورڈ کو لگا دینے اور اس گھر کے مسجد ہونے کا اعلان کر دینے کے بعد اب تم کو حق کیا ہے کہ تم اس عبادت گاہ میں رقص و سرود کے ہنگامے بپا کرو، اب تو یہاں تمکو اقامتِ صلوٰۃ اور ذکرِ الٰہی اور درسِ قرآن کا انتظام کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر ان کی صلاحیتوں سے اور ان کے طرزِ عمل سے قطعی مایوسی ہو جائے تو ان کی برطرفی کا فیصلہ کرنا پڑے گا اور عوام کا فرض ہوگا کہ متفقہ فیصلے کے ساتھ ان کو ہٹا دیں اور نئے خدام فراہم کریں۔

انگریزی نظام کے تحت سرزمین ہند کی حیثیت ایک تبکدے یا ایک میکدے کی سی تھی۔ مسلمان قوم کے لیڈروں نے عوام کو دعوت دی کہ یہ سارا تبکدہ تو مسجد میں نہیں بدلا جا سکتا آؤ اسکو تقسیم کرالیں، تاکہ ہم اپنے حصے کی عمارت کو مسجد بنا کر خدا کی عبادت کا حق ادا کر سکیں۔ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور تقسیم ہو گئی۔ ہمارے لیڈر اس تقسیم شدہ جائداد کے اس حصے کے جو پاکستان کے نام سے مسلمانوں کو ملا تھا، از خود منتظم قرار پا گئے۔ لیکن انتظام کو سنبھالنے کے بعد ان حضرات نے اپنے قیامِ صلوٰۃ اور تعمیرِ مسجد کے وعدوں کو جب بھلانے کی کوشش کی اور متفرق قسم کے بیانات دینے لگے تو قوم میں تشویش پیدا ہوئی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی نے مطالبۂ نظام اسلامی کی تحریک کا آغاز کیا تاکہ ایک مرتبہ ان منتظمینِ پاکستان سے ایک دستوری دستاویز حاصل کر لی جائے کہ وہ جلد از جلد اسے مسجد بنائیں گے اور اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام کریں گے۔ یہ کام اللہ کے فضل سے بخوبی انجام پا گیا، جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس دستاویز کے لکھ دینے اور مسجد کا بورڈ لگا دینے کے بعد بھی تبکدہ جوں کا توں ہے اور اس میں بدستور وہی مشاغل جاری ہیں جو انگریز کے نظامِ کافرانہ میں جاری تھے، کسی طرح کی تطہیر کا سلسلہ شروع نہیں ہو رہا اور بار بار کی تاکید اور ایک عرصے کے صبر کے بعد جب اپنے اکابر کے متعلق یہ ثابت ہو گیا کہ یہ

تبلدے کو مسجد بنانے پر تیار بھی نہیں ہیں اور اس میں ذکر و عبادت کو جاری کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تو مجبوراً یہی فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ خدامِ مسجد کو بدل دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ خدامِ مسجد کے فسق و فجور سے مسجد کے حقوق میں تو فرق نہیں آسکتا، وہ تو اس دن سے مسجد بن گئی جس دن اس کے مسجد ہونے اور خدا کے لئے وقف ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ پوزیشن بالکل غلط ہوگی کہ آپ اپنے اکابر سے یہ کہیں کہ تم لوگوں نے جو اعلان کیا ہے اور جو بورڈ آویزاں کیا ہے، ہم اسکو نہیں مانتے، کیونکہ تم نے بدنیتی سے یہ کام کیئے ہیں۔ بخلاف اس کے کہنا یہ چاہیئے کہ تم نے جب مسجد بنانے، اس میں عبادت کا انتظام کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس کے اوپر عبادت گاہ ہونے کا بورڈ لگایا ہے تو پھر یا تو اپنی ذمہ داریاں پوری کر دو یا الگ ہو جاؤ کہ ہم دوسرے کارکنوں سے کام لیں۔ کتنی عجیب بات ہوگی کہ قرض خواہ کو مقروض نے جو تحریر لکھ کے دی ہو اُس کے ناقابلِ وثوق ہونے کا اعلان خود قرض خواہ کرنے لگے۔ ایسا قرض خواہ تو اپنی رقم ڈبو دے گا۔ اسی طرح ایک وقف نامے کے متعلق اگر پبلک یہ کہے کہ یہ تو بدنیتی سے لکھا گیا ہے تو وقف کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسے توڑ و راس پر دینا چاہیئے کہ وقف نامہ لکھا ہے تو فھو المراد، لیکن براہِ کرم اب اپنی تحریر کی شرائط کو پورا کرو۔ عین اسی طرح ہمارے حکمرانوں نے قراردادِ مقاصد کو کسی بھی نیت سے پاس کیا ہو، اب تو یہ ان کے گلے کا پھندا بن چکی ہے اور اسے پکڑ کر ان کو سیدھے راستے کی طرف کھینچا جاسکتا ہے۔

(د) یہ بات اگر ہم حکمرانوں سے کہیں کہ دیکھئے محض بورڈ لگا دینے سے تو تبلدے کا نظام مسجد کے نظام میں نہیں بدل جایا کرتا، یا محض اعلان ہی اعلان تو ایک نظامِ زندگی کو اسلامی نظامِ زندگی نہیں بنا دیتا، اس کے لئے تبدیلی کے عملی مراحل بھی طے کرنے پڑتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ بورڈ اتار دیا جائے اور اعلان واپس لے لیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب عملی ذمہ داریوں کو پورا کیجیے، ورنہ الگ ہو جایئے تاکہ اسے پورا کرنے کے لئے دوسرے لوگ کام کر سکیں۔

(س) اب مزید ایک پہلو پر غور کیجیے۔ ایک عمارت کے مسجد ہونے کا اعلان ہوتے ہی وہ عمارت مسجد کے حقوق حاصل کر لے گی یعنی اس کے املاک کو نقصان سے بچانا، اسکی صفائی کی کوشش کرنا، اسے کسی کے شخصی قبضے میں جانے سے محفوظ رکھنا، یہ سب فرض ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس عمارت کی تطہیر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے اندر

بت بھی پڑے ہوں، تصویریں بھی کندہ ہوں، غیر اسلامی سرگرمیاں بھی جاری ہوں تو یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ اس کا نظام کار بھی عملاً نظامِ عبادت بن چکا ہے، بلکہ اس کے لئے جد وجہد کرنا فرض ہوگا۔ پھر اسی طرح اس کے منتظمین اگر اذان، اقامت، امامت، نماز، درس و تدریس اور ذکرِ الٰہی، خطبہ و وعظ وغیرہ کے انتظامات عمل میں لانے کا فرض ادا نہ کر رہے ہوں اور اس کے لئے ضروری صلاحیتیں رکھنے کا ثبوت نہ دیں تو ان کو امام، خطیب، مدرس اور مؤذن کے سے حقوق حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ ان حقوق کو دینے میں ان کی نیتوں اور عزائم اور رجحانات اور طرزِ زندگی اور قابلیتوں کو دیکھنا لازم ہوگا۔

اس فرق کو ملحوظ رکھکر غور کیجئے کہ اگر اس نئی بننے والی مسجد کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے کوئی مجلس یا کمیٹی بنے تو اس میں صالحین کا شریک ہونا اور اسے فاسقین سے پاک کرنے کی کوشش کرنا عین اسلامی فرض ہوگا یا نہیں؟ فرض کیجئے کہ اس موقعہ پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ کل اسی عمارت کے نظم و نسق کے چلانے کے لئے جو کمیٹیاں بنا کرتی تھیں، تم ان میں شریک ہونے کو حرام بتلاتے تھے، لیکن آج محض ایک اعلان اور بورڈ کے بل پر یہ حرمت حلت میں کیسے بدل رہے ہوں۔ حالانکہ معترض اس بات کو نہیں سوچ رہا کہ کل تک یہ عمارت کاملاً غیر اللہ کی ملک اور غیر اسلامی مقاصد کے لئے استعمال ہونے والی عمارت تھی اور اسکی مجلس منتظمہ نے نہ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا تھا، نہ حدود اللہ کی پابندی کا اقرار کیا تھا۔ لیکن اب اس عمارت کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر بنانے کے لئے وقف قرار دیا جا چکا ہے اور اسکی مجلس منتظمہ نے اعلان کر دیا ہے کہ اب وہ اپنا دستور العمل خدا کی نیابت اور حدود اللہ کی پابندی کے اصولوں پر بنا کر کام کریگی، اور اب سے اس کا مقصدِ وجود صرف یہ ہوگا کہ وہ پیشِ نظر عمارت کی تعمیرِ جدید کر کے اسے مسجد میں بدلے، غیر اسلامی شعائر و مناسک کو ختم کر کے اس میں اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام کرے تاکہ اس میں کما حقہٗ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

اس اعلان کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ بہت اچھا، اسلام کا قانونِ معابد یہ ہے کہ انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاخر واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ۔ اس قانون کی رُو سے ہم اب مناسب منتظمین کو اس میں لائیں گے اور غلط قسم کے متولیوں سے پاک کریں گے۔

اس استعارے سے اب مدعا واضح ہو گیا۔ پہلے اسمبلیاں انگریز کے طاغوتی نظام کو چلانے کے لئے تھیں،

لیکن اب قراردادِ مقاصد نے ان کے مقصد کو بنیادی طور پر بدل دیا ہے۔ اب ان کا کام غیر اسلامی نظام کو ایک تیز رفتار تدریج سے اسلامی نظام میں بدلنا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔

(س) بعض حضرات یہ اعتراض بھی اٹھاتے ہیں کہ عقیدہ اور مقصد کے بدلنے کا اعلان کرنے کے باوجود ابھی تک دستور العمل تو ایکٹ ۱۹۳۵ء ہی ہے۔ یہ بجا لیکن عقیدہ و مقصد کے بدلنے کا اعلان کرتے ہی سب کچھ از خود بدل نہیں جاتا، بلکہ تبدیلی کو عمل میں لانے کے لئے ایک عبوری دور طے کرنا پڑتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں عملاً تبدیل کرنے کی بھاری مہم اہل ایمان اور صالحین کے بغیر عمل میں آسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام صالحین کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پس یہ درست نہ ہوگا کہ سٹیٹ کے عقیدہ کی تبدیلی کا اعلان ہوتے کے بعد صالحین میدانِ عمل سے الگ پڑے رہیں کہ جب تک اسلام سے پھرے ہوئے لوگ اسلامی دستور بنا کر پورا اسلامی نظام قائم نہ کر چکیں گے، اس وقت تک ہم اپنی خدمات پیش نہیں کر سکتے۔ تعمیر مسجد اور اقامتِ صلوٰۃ کے اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تو ہم تیار نہیں ہیں، البتہ یہ کام دوسرے لوگ کر دیں تو پھر امامت، خطابت، اذان اور درس وغیرہ کی ذمہ داریاں ہم سنبھال سکیں گے۔ حالانکہ پھر آپ کی ان خدمات کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

دراصل ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بھی عملی حالتاً قائم نہیں رہا، بلکہ اب اسکی ترکیب یوں ہے :-

(۱) ایکٹ ۱۹۳۵ء + (۲) انڈی پنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء + (۳) قراردادِ مقاصد ۱۹۴۹ء دوسرے لفظوں میں اس ایکٹ کو بدلنے کا فیصلہ بھی اب اس کے ساتھ شامل ہو چکا ہے، یا یوں کہیئے کہ اس ایکٹ کے ساتھ اسکی نفی بھی الملتصق ہے۔ پس نئے دستور کی ترتیب اور اس کے نفاذ کے دوران میں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بعض اجزا کو اضطراراً جوں کا توں استعمال کرنا پڑے گا اور بعض اجزا کی فوری ترمیمیں بذریعہ وقتی احکام (ordinances) کی جا سکیں گی۔

انڈی پنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء نے دوسری ترمیموں کے ساتھ ایکٹ ۱۹۳۵ء میں یہ اہم ترمیم بھی کر دی ہے کہ اب شاہِ برطانیہ کے لئے حلف وفاداری نہیں لیا جاتا اور وہ بیجز تھی جو شرک ہونے کی وجہ سے بنیادی طور پر سابق اسمبلیوں کی شرکت میں ایک مسلمان کے لئے حائل تھی۔ اب قراردادِ مقاصد نے اصل مرکز وفاداری یعنی حاکمیت

الٰہی کو متعین کر دیا ہے اور اب حلف کی نوعیت میں مزید تبدیلی دستور کے دوران میں لازماً ہو گی۔ اس وقت بھی حلف کا محور پاکستان کی خیر خواہی ہے اور کون مسلمان اس کا خیر خواہ نہ ہو گا۔

(ص) گھٹنے ٹیک دینے والے جس فقرے کا حوالہ آپ نے دیا ہے، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ارکانِ دستوریہ کی نیتوں کے متعلق کوئی شرط عاید کی جائے، بلکہ وہ تو صرف ایک زوردار اسلوبِ بیان ہے اور اس مجبوری کو ظاہر کرتا ہے جس کے تحت ہمارے نمائندوں کو ملت کا مطالبہ ماننا پڑا۔

---

## سول لبرٹیز یونین میں شرکت کی نوعیت

سوال (۳) آپ نے سول لبرٹیز کے قیام پر زور دیا ہے۔ کیا یہ تصور اسلامی ہے؟ کیا ہم ارتداد کو بھی گوارا کریں گے؟ اس تحریک کے چلانے والے کمیونسٹ لوگ ہیں۔ کیا مصلحت کی خاطر ان لوگوں سے شرکتِ عمل اور یک محاذی جائز ہے؟

(۳) اس سوال کے جواب میں پہلے تو آپ کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ لاہور کی مرکزی سول لبرٹیز یونین سے جماعت اسلامی کے ارکان الگ ہو چکے ہیں۔

ویسے سول لبرٹیز یونین کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک غیر سیاسی جماعت ہے اور اسکی ترکیب ہر جگہ مختلف خیالات کے شہریوں سے کی گئی ہے۔ اس کے اندر کمیونسٹ خیالات کے لوگ بھی شامل ہیں، لیکن یونین اُن کی نہیں ہے۔ نہ اسکی تعمیر کمیونزم کے اصول و مقاصد پر کی گئی ہے۔ یہ شہری آزادی اور شہریت کے حقوق کے مطالبے کا ایک غیر سیاسی ادارہ ہے، جیسے تاجروں، مزدوروں اور مدرسین کی انجمنیں ان کے مختلف حقوق کی حفاظت کے لئے قائم ہوتی ہیں اور جن میں اس کا لحاظ نہیں ہوتا کہ اس کے جملہ شرکا بہر حال مسلم ہوں اور صالحین ہوں

ہم نے اس مشترک مقصد کی غیر سیاسی انجمن میں خدا اور رسول ہی کے دیئے ہوئے ایک حق کی حفاظت کے لئے شرکت کی تھی، نہ کہ ایسے امور کے لئے جو شریعت کی حدود سے آزاد ہوں، نیز شرکت کرتے ہوئے یہ بات طے کر لی تھی اور جماعت نے بھی اس کے لئے سرکلر جاری کر دیا تھا کہ ان انجمنوں میں شرکت اسی وقت تک رہے گی جب تک کہ یہ عوام کی صحیح نمائندہ ہوں اور کسی ایک خاص عنصر کی اجارہ داری ان پر نہ ہو اور ان کو کوئی خاص جماعت

اپنے سیاسی اغراض کا آلۂ کار نہ بنا سکے اور یہ کہ ان انجمنوں کی سرگرمیاں اسلام اور ریاستِ پاکستان کے مفاد کے خلاف نہ جانے پائیں۔

ہم اس فیصلے پر نہیں گئے تھے کہ جو فیصلہ اور جو طرزِ عمل بھی اس انجمن کا ہو جائے ہم اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے، بلکہ اس فیصلے پر گئے تھے کہ جب کوئی فیصلہ یا طرزِ عمل مندرجہ بالا شرائط کی حدود سے باہر ہو جائیگا تو ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے، نیز جہاں حالات قابو سے باہر ہوتے نظر آئیں گے۔ ہم بلا تامل الگ ہو جائیں گے۔ چنانچہ عملاً یہی کیا گیا ہے۔

---

## مسئلہ کشمیر اور نبی بخش صاحب نظامی

سوال:۔ (۳) امیر حکومت، حضرت مولانا نے (۱) کشمیر کے متعلق پہلے سکوت کیوں اختیار کیا۔ (۲) پشاور میں مہر سکوت توڑ کر اخبارات میں اعلان کرنے کے متعلق ممانعت کیوں نہ فرمائی۔ یہ کیوں کہا کہ اس سلسلے میں "آپ اپنے عمل کے مختار ہیں"۔ اگر سکوت اتنا ضروری تھا کہ اعلائے کلمۃ الحق سے مانع تھا تو پھر اعلان کی شدید ممانعت کیوں نہ فرمائی؟

نبی بخش نظامی کے متعلق قیاسات بے ثبوت معلوم ہوتے ہیں اور سوءِ ظن کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ سیاسی لوگ اس طرح کی باتیں کریں تو مناسب ہے جماعت اسلامی کو اس قسم کی قیاس آرائی زیبا نہیں۔ آخر حکومت نے بھی تو اس قسم کی منطق سے کام لیا اور اکابر جماعت کو قید کر رکھا ہے۔

(۳) کشمیر کے متعلق مولانا کو جو اختلاف تھا اسے اگر انہوں نے علی الاعلان کہتے پھرنے سے احتراز کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک داعیِ حق اقامتِ دین کے لئے جب جدوجہد کر رہا ہوتا ہے تو کام کا ایک نقشہ اور ایک اسکیم لے کے چلتا ہے اور قدم قدم پر یہ سوچتا ہے کہ کب کس اصلاح کے لئے دعوت دینے کا بہترین موقع پیدا ہوتا ہے اور کب کوئی چیز مقدم ہے اور کب کسی امر سے اصلاح کے بجائے فتنہ پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ اسی کو حکمتِ دین کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر چیز ہر وقت علی الاعلان کہی جائے۔

مولانا کے پیشِ نظر یہ حقیقت تھی کہ مطالبہ کی تحریک سے نظامِ زندگی کی جس کلی اصلاح کے لئے وہ جدوجہد کر رہے تھے، اس کے دوران میں اگر مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنے اجتہادی اختلاف کو انہوں نے پیش کر کے ایک جزئی معاملے

پر توجہ صرف کی تو کلی اصلاح کے پروگرام کو ضعف پہنچ سکتا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے سکوت اختیار کیا۔ لیکن جب ان سے مسئلہ پوچھا گیا اور باصرار پوچھا گیا تو کتاب اللہ کے ایک عالم کی ذمہ داری کے پیش نظر انہوں نے اپنی رائے ظاہر کر دی اور یہی انہیں کرنا چاہیئے تھا۔

پشاور میں جب سائل صاحب نے ان سے کہا کہ میں تو اس بات کو شائع کراؤنگا تو مولانا نے ان کو اس حرکت سے باز رہنے کے لئے یہ کہا کہ اس حرکت سے تم جتنا نقصان مجھے پہنچانا چاہتے ہو، اس سے زیادہ نقصان تم جہادِ کشمیر کو پہنچاؤ گے۔ ان الفاظ سے انہوں نے سائل کو اپنی رائے کی اشاعت سے روکا اور یہ بھی کہا کہ اگر اسے شائع کرانا ہوتا تو میں خود ہی اس کا انتظام کر چکا ہوتا۔ لیکن سائل صاحب نے باصرار کہا کہ نہیں میں تو شائع کراؤنگا۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ آپ اپنے عمل کے مختار ہیں یعنی اگر معاملہ میری اجازت سے متعلق ہے تو میں تو روک رہا ہوں، لیکن اگر آپکو اجازت کے بغیر کرنا ہی ہے تو اب آپ کو اس کا اختیار تو حاصل ہو ہی چکا ہے! اس فقرے کے معنی اجازت کے نہیں ہوتے، بلکہ سمجھانے کے بعد خاتمۂ کلام کے لئے جب یہ الفاظ کہے جاتے ہیں تو مفہوم یہی ہوتا ہے کہ اجازت کے بغیر اگر کوئی اقدام کرنا ہی ہے تو پھر کون روک سکتا ہے۔ آپ خود بھی سوچیئے کہ مولانا سائل صاحب پر جبر کیسے کر سکتے تھے بے بسی تھی!

کسی شخص کا نام ہماری طرف سے اگر شائع ہوا ہے تو وہ اس طرح نہیں ہوا کہ اسکے بارے میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے قیاس آرائی کر لی گئی ہے کہ یہ صاحب نبی بخش نظامی ہونگے جو ان دنوں آزاد کشمیر گورنمنٹ کے پروپیگنڈہ سکرٹری تھے۔ اگر یہ قیاس آرائی ہی کرنی ہوتی تو کیوں نہ وزیر اعظم پاکستان کا نام دے دیا جاتا۔ درحقیقت نام کو شائع کرنے سے قبل پوری طرح تحقیق کر لی گئی تھی۔ اول تو خود اس صحبت ہی میں ان سائل صاحب کا تعارف کرایا گیا تھا، لیکن مولانا نام بھول گئے تھے۔ اس کے بعد پشاور کی جماعت کے ارکان کی معرفت باقاعدہ تحقیقات کی گئی اور جب ساری تفصیلات بل گئیں تو اس وقت یہ نام برسر عام رکھا گیا۔ اس نام اور عہدے کے متعلق تحقیقات آج نہیں، بلکہ بہت پہلے کر لی گئی تھی، چنانچہ مولانا کے اس سے قبل کے بیانوں میں اس کا ذکر اشارۃً ہوا ہے، اور خود ہم نے تقاریر میں اس کا ذکر بار بار کیا ہے۔ اب جبکہ ترجمان القرآن میں واقعہ کی تاریخ بیان کی گئی تو زیادہ صاف صاف طریق سے حوالہ دے دیا گیا۔

اگر نبی بخش نظامی صاحب اس سے انکار کریں تو پھر واقعی ہمارے ذمے ہوگا کہ ہم شہادتیں بہم پہنچادیں۔ آخر ایک شخص کے متعلق کھلم کھلا پریس میں ایک واقعہ بیان کیا جارہا ہے تو اس کے لئے تو موقع ہے اگر واقعہ کا تعلق اس سے نہیں ہے تو وہ انکار کرے۔